شاد عظیم آبادی

میر اور پھر غالب کے دور میں پورے عروج پر پہنچنے کے بعد اردو غزل پر ایک زوال کا دور بھی گزرا۔ ملک میں انگریزوں کے قدم جم جانے کے بعد ہر چیز کو انگریزی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ اردو شاعری کا جب انگریزی شاعری سے مقابلہ کیا گیا تو ہمارے بزرگوں بالخصوص سرسید اور حالی کو یہ بالکل ناقص و ناکارہ نظر آئی اور انھوں نے بار بار کہا کہ جو ادب افادیت اور مقصدیت سے خالی ہو اسے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرع طرح کے بجائے کوئی عنوان دے دیا جاتا تھا اور شاعر اس موضوع پر نظمیں کہہ کر سناتے تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالی بھی ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے۔ انھوں نے کئی مشاعروں میں شرکت کی اور متعدد نظمیں لکھیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے نظم نگاری کی حمایت میں ایک اہم لکچر دیا۔ مولانا حالی نے قصیدہ و غزل کے خلاف آواز اٹھائی اور نظم نگاری کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور نظم کو فروغ ہونے لگا۔ اس وقت عام رائے یہ تھی کہ اب غزل کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے اور یہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ یہ خیال عام تھا کہ آنے والا دور غزل کا نہیں نظم کا دور ہوگا۔

اس زمانے میں جب لوگ غزل سے مایوس ہو چلے تھے اور اس کا خاتمہ یقینی نظر آ رہا تھا ایک نئی آواز نے اردو شاعری کے قارئین اور سامعین کو چونکا دیا۔ یہ نئی آواز شاد عظیم آبادی کی تھی۔ غالب نے اردو غزل کے موضوعات کو وسعت دینے اور اسے نئی جہتوں سے آشنا کرنے کا قابلِ قدر کارنامہ شاد کے زمانے سے کچھ ہی پہلے انجام دیا تھا لیکن عام غزل گو ابھی تک پامال راستوں پر چل رہے تھے اور فرسودہ روایتی مضامین کو لفظوں کے معمولی ردوبدل کے ساتھ پیش کیے جا رہے تھے۔ اس لیے اردو غزل میں جاذبیت باقی نہیں رہی تھی۔ شاد کی غزل موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے

Scanned by TapScanner

مختلف تھی۔ جہاں تک ہو سکا انھوں نے پامال مضامین سے دامن بچایا۔ جھوٹے عشق کے گھسے پٹے قصّوں میں انھیں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی تھی۔ بے شک شاد کی غزل میں اچھوتے اور اعلا درجے کے افکار و خیالات نظر نہیں آتے لیکن عام زندگی میں پیش آنے والے تجربات جو اپنے اندر تازگی بھی رکھتے ہیں اور ہماری حقیقی زندگی سے ان کا گہرا رشتہ بھی ہے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان تجربات کو بلاشبہ اہم اور بیش قیمت کہا جا سکتا ہے۔

موضوعات کے علاوہ شاد کی غزل کا اسلوب بھی اُس زمانے کے عام اردو شاعر سے مختلف ہے۔ سادگی دہلی کے دبستانِ شاعری کا نمایاں وصف ہے جب کہ بناؤ سنگھار اور رنگینی و رعنائی لکھنو کے دبستانِ شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔ شاد دبستانِ دہلی سے ذہنی مناسبت رکھتے ہیں دبستانِ لکھنو سے بھی انھوں نے بہت کچھ لیا ہے۔ ان کے یہاں تصنع اور بناوٹ تو نام کو نہیں لیکن شگفتہ بیانی قدم قدم پر قاری سے داد و تحسین وصول کرتی ہے۔ میر کے سادہ اور بے ساختہ اندازِ بیان میں اگر آتش کی رنگینیِ بیان کی آمیزش کر دی جائے تو شاد کا اسلوب وجود میں آجاتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے دہلی اور لکھنو دونوں دبستانوں کی خوبیاں اپنا لیں اور خامیاں چھوڑ دیں۔ شاد عظیم آبادی کے رنگِ سخن کی بابت سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں :۔

"شاد کی شاعری حسن و عشق کے عامیانہ اور سوقیانہ اندازِ بیان سے تمام تر پاک ہے۔ پاکبازانہ حسن و عشق، رزم و بزم کی دلکش روداد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاق، فلسفہ، تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے۔ چھوٹے الفاظ میں سادہ ترکیبیں ہیں، بیان میں وہی رفعت ہے۔ میر ہی کے اوزان و بحور میں وہی اندازِ کلام ہے، وہی فقیرانہ صدا ہے۔ اس لیے شاد کو اس دور کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔"

سید صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ شاد عظیم آبادی پرانی روش پر چلنے والے انسان تھے اور میر کی پیروی کو ہی انھوں نے سب کچھ جان لیا تھا۔ شاد ایک جدید ذہن کے مالک تھے۔ وہ ایک عرصہ تک آنریری مجسٹریٹ بھی رہے اور اس پیچیدہ ذمہ داری کو انھوں نے

Scanned by TapScanner

بہت سلیقے سے ادا کیا۔ ان کے بیدار مغز ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ ان چند اصحاب میں تھے جو سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی مہم کو سراہتے تھے۔ مولانا حالی کے تعاون سے شاد نے سرسید سے ملاقات کی علی گڑھ میں قیام کیا، کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو دیکھا اور اس سے متاثر ہو کر کئی رباعیاں کہہ کے سرسید کی خدمت میں پیش کیں۔ سرسید ان رباعیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنے مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ انھیں علی گڑھ گزٹ میں شائع کیا:۔

"اس ہفتے جناب مستطاب سید علی محمد صاحب شاد رئیس پٹنہ جو اپنے کمالات میں مشہور و بے مثال ہیں، دہلی سے مراجعت کرتے وقت علی گڑھ میں اترے اور مدرسۃ العلوم کے بنگلے میں مہمان ہوئے۔ مدرسہ اور بورڈنگ کو ملاحظہ کر کے اظہارِ مسرت کیا اور معائنے کے وقت دس بارہ پاکیزہ رباعیاں عالی مضامین کے ساتھ تصنیف فرمائیں جن کو میں نہایت خوشی اور شکر گزاری کے ساتھ ذیل میں چھاپتا ہوں۔"

ان میں سے دو رباعیاں یہاں درج کی جاتی ہیں ــــــ

پورا مری اک عمر کا ارمان کیا　　کس لطف سے ہر طرح کا سامان کیا
سید سے ملا، مدرسہ بھی دیکھا　　حالی نے یہ بہت بڑا احسان کیا

✳

سرمایۂ عمرِ جاودانی ہے یہی　　اس قوم کی دلچسپ کہانی ہے یہی
اب صفحۂ دنیا سے مٹے گی نہ کبھی　　سیّد تری ہمت کی نشانی ہے یہی

اپنی مصروفیات کے باوجود شاد نے شاعری کی طرف پورے خلوص اور پوری سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی۔ خداداد صلاحیت، اس پر مشقِ سخن نتیجہ یہ کہ شاد کا کلام اہلِ نظر کے لیے سرمایۂ انبساط بن گیا۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے ــــــ

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی　　جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

بزمِ مے سے مراد ہے دنیا اور دنیا کو شراب کی محفل اس لیے کہا گیا کہ نشے کے عالم میں سب کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے۔ یہی اس دنیا کا حال ہے۔ اس لیے یہاں جس نے کوتاہ دستی سے کام لیا یعنی اپنا ہاتھ سکیڑ لیا وہ مینا یعنی صراحی سے محروم رہا اور جس نے ہاتھ بڑھا دیا اسے یہ صراحی میسر آگئی۔ مطلب یہ کہ دنیا میں کامیابی

اسی کو نصیب ہوتی ہے جو انتظار نہ کرے بلکہ جو کچھ حاصل کرنا ہے وہ اپنی کوشش سے حاصل کرلے۔ اب کچھ اور شعر بلا تشریح ملاحظہ فرمائیں ـــــ

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

مرغانِ چمن کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

کون ظالم باغباں تھا اے چمن
بجائے گل کانٹے جو تجھ میں بو گیا

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

یہاں دل پر بنی ہے تجھ سے اے غم خوار کیا الجھوں
یہ کون آرام ہے، مر جاؤں تب آرام آئے گا

تری تلاش میں ہم نے ملا دی خاک میں عمر
تو ہی بتا کہ یہ کم بخت رہ کے کیا ہوتی

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے۔

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

دیکھا آپ نے کیسی دلکشی و رعنائی ہے شاد کے اشعار میں اور انھوں نے اپنے شعروں میں کیسے قابلِ قدر تجربات کو کیسے شعری آداب اور متین رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

حسرت موہانی

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مولانا حسرت موہانی کی غزل گوئی کے بارے میں فرمایا ہے :-

"حسرت خالص غزل گو تھے۔ ان سے پہلے بھی بڑے جید غزل گو گزرے ہیں معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ پھر بھی حسرت کی غزل گوئی ممتاز اور منفرد ہے۔ اس لیے کہ حسرت غزل کا سہارا غزل ہی سے لیتے ہیں کسی اور سے نہیں۔ غزل گوئی کو اگر کرے معیار حسرت ہی ہوں گے۔"

پروفیسر صدیقی نے جو کچھ فرمایا وہ حرف بحرف درست ہے۔ حسرت نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اردو غزل کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ سرسید کے اثر سے حالی نے غزل کو ناقص اور مضر صنفِ سخن قرار دیا۔ مجنوں گورکھپوری کے لفظوں میں "حالی پر ایک پیر دیرینہ سال (یعنی سرسید) کا رعب کچھ ایسا چھایا کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ بلبل کی ہم زبانی چھوڑ کر وہ چمن والوں کو کیا نقصان پہنچا رہے ہیں۔" حالی نے غزل کو بے وقت کی راگنی قرار دیا۔

غزل پر حالی کی تنقید اور نظم کی وکالت سے ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ غزل کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ ایسے میں حسرت موہانی نے غزل کا راگ چھیڑا۔ وہ غزل گو بھی تھے اور غزل کے پارکھ بھی۔ انھوں نے غزل کے فن پر مسلسل غور کیا اور بہت سے مضامین لکھے۔ ابتدائی زمانے میں انھوں نے غزل کے علاوہ باقی اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ غزل کے لیے بنے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اپنے دیوان میں لکھا کہ "راقم حروف کی طبیعت نے اپنے لیے اصنافِ سخن میں غزل کو اپنے حسبِ حال پاکر منتخب کر لیا ہے۔" اسی خیال کو انھوں نے بار بار اپنے شعروں میں بھی پیش کیا۔

لکھتا ہوں مرثیہ، نہ قصیدہ نہ مثنوی — حسرت غزل ہے صرف مری جان عاشقاں

Scanned by TapScanner

عشقِ حسرت کو ہے غزل کے سوا　　نہ قصیدے نہ مثنوی کی ہوس

جس شاعر نے اساتذہ کے کلام کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس مطالعے کے نتائج مستقل مضامین کی شکل میں پیش کیے ہوں، ظاہر ہے اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ کس شاعر کی پیروی کرنی چاہیے۔ یوں تو حسرت نے یہ بھی کہا کہ ــــــ

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن　　طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

میر کی عظمت کے آگے بھی سر جھکایا (شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرت ؛ میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں) سعدی، جامی اور حافظ جیسے بلند پایہ فارسی غزل گو شعرا کی خدمت میں بھی خراجِ عقیدت پیش کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ حسن پرست بھی تھے اور عاشق مزاج بھی۔ اور ان کا عشق خاص عشقِ مجازی تھا جس میں ہوسناکی بھی شامل تھی اس لیے ان کا دل مومن کی طرف کھنچتا تھا کیونکہ مومن کی شاعری میں عشق مجازی کی سنبھلی ہوئی کیفیتیں ملتی ہیں۔ اس لیے انھوں نے تسلیم کی شاگردی اختیار کی اور تسلیم و نسیم کے واسطے سے اپنا رشتۂ سخن مومن سے جوڑ لیا۔ حسرت نے اپنے شعروں میں مومن اور نسیم کی غزل کو بہت سراہا ہے۔ دیکھیے ــــــ

حسرت مرے کلام میں مومن کا رنگ ہے　　ملکِ سخن میں مجھ سا کوئی دوسرا نہیں

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں　　مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

حسرت تری شگفتہ کلامی پہ آفریں　　یاد آگئیں نسیم کی رنگیں نگاریاں

مرحبا حسرت نبا ہا خوب اندازِ نسیم　　لطف ہر ہر شعر میں ہے بندشِ استاد کا

کلیاتِ حسرت میں مومن اور نسیم کی تعریف میں متعدد اشعار ملتے ہیں۔ ان دونوں شاعروں کے محاسنِ شعری کو حسرت نے اپنے مضامین میں بھی سراہا ہے۔ مومن کے اندازِ بیان نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ مومن کی دلفریبیِ خیال اور رنگینیِ بیان کا حسرت نے کئی جگہ ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ نسیم نے یہ خوبیاں اپنے استاد مومن سے حاصل کیں۔ یہاں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ حسرت نے اپنی غزل میں مومن اور نسیم کی پیروی کی اور اپنی شاعری کو ان دونوں ماہرینِ فن کی غزل کی کاربن کاپی بنا دیا۔ حسرت نے اردو فارسی اساتذۂ فن کے کلام کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور ان کی خوبیوں کو اپنی طبیعت میں رچا بسا لیا تھا۔ لیکن اس طرح کہ ان اساتذہ کے اثرات گھل مل کر ایک نئے انداز میں حسرت کی غزل میں نمایاں ہوئے۔

Scanned by TapScanner

حسرت حسن پرست تھے اور نوعمری سے عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ شاعری پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ شاعری میں کامیاب مصوری ضروری ہے اور مصوری اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب اس میں جذباتِ انسانی کی ہوبہو تصویر اتار دی گئی ہو۔ عشق انسانی جذبات میں سب سے قوی جذبہ ہے۔ جنسی جذبات کی پیشکش بھی شاعری کا ایک لازمی حصہ ہے اور اسے عیب قرار دینا ناانصافی ہے۔ سیدھے سچے اور بے ریا عشق کا یہ جذبہ سیدھے سادے لفظوں میں اظہار چاہتا تھا اور شعروں کا روپ اختیار کرنے کے لیے حسرت کے دل میں بیتاب تھا۔ اس کی پیش کش کے لیے شاعر نے مومن کے پیرائے کو مناسب ترین جانا اور اپنا لیا۔

حسرت کا عشق تصنع سے عاری ہے۔ یہ اس کی سادگی اور معصومیت ہی تو ہے کہ وہ پردوں میں مستور رہنا نہیں چاہتا اور اپنے خلوص سے حسن کو گرویدہ بنا لینا چاہتا ہے۔ صنفِ نازک اپنی ساری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ کلامِ حسرت کی محبوبہ ہے۔ یہ محبوبہ بے وفا اور ہرجائی نہیں۔ صبر آزمائی حسینوں کا شیوہ ہے سو وہ اس کا بھی ہے لیکن اس میں شرم وحیا بھی ہے مگر اپنا سب کچھ اپنے عاشقِ صادق کو سونپ دینے کا حوصلہ بھی۔

کلامِ حسرت کا مطالعہ کیجیے تو عشق و محبت کی ساری وارداتیں اپنی تمام دلکشی کے ساتھ اس میں سمٹ آئی ہیں۔ مومن کی طرح حسرت بھی فکر و فلسفے کے خارزار میں نہیں اُلجھتے۔ اپنے آرٹ کی پیش کش کے لیے زندگی کے ایک پہلو، سب سے جاندار پہلو اور صرف ایک جذبے مگر سب سے قوی جذبے یعنی عشق کا انتخاب کر لیتے ہیں اور پھر اسے ہر زاویے سے پیش کرتے ہیں۔ اس کے سارے امکانات کو بروے کار لاتے ہیں، اس کی تمام کیفیتوں اور اس کے تمام نشیب و فراز کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اور بالکل تقاضائے فطرت کے مطابق اس میں تھوڑی ہوسناکی بھی شامل ہو جاتی ہے جس پر وہ شرماتے نہیں۔ اسے وہ فطرتِ انسانی کا لازمی تقاضا خیال کرتے ہیں۔ فحاشی اور عریانی سے وہ بہرحال اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں۔ اکثر موقعوں پر وہ جرأت کے کافی نزدیک پہنچ جاتے ہیں مگر ان کا تنقیدی شعور اور ان کی سنجیدہ مزاجی کام آتی ہے اور وہ ساتھ خیریت کے اپنی اصل قلمرو میں لوٹ آتے ہیں۔

حسرت کی عشقیہ شاعری کا ذکر اس غزل کے بغیر نامکمل ہے جو ایک طرح سے نظم کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے یعنی وہ غزل "چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے"، غزل طویل ہے اس کے دو ایک شعر یہاں

Scanned by TapScanner

پیش کیے جاتے ہیں ــــ

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا — اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گدگدانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ — مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ — حال دل باتوں ہی باتوں میں سنانا یاد ہے

اور چند اشعار :

وصل کی رات چلی ایک نہ شوخی ان کی
کچھ نہ بن آئی تو چپکے سے کہا مان گئے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
لاکھوں ہیں تری دید کے مشتاق مگر ہم — محروم تجھے دل سے بھلانے میں لگے ہیں
ایک ہی بار ہوئیں وجہ ستمگاریِ دل — التفات ان کی نگاہوں نے دوبالا نہ کیا

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

پڑھ کے خط تیرا مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

حسرت کی عشقیہ شاعری کے سلسلے میں ان غزلوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے — بندہ پرور! جائیے، اچھا، خفا ہو جائیے
دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے — کسے یقین ہو کون اس کا اعتبار کرے
بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں — الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حسرت کی زبان کے بارے میں بھی یہاں کچھ کہنا ضروری ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں یہ بات کئی بار دہرائی گئی ہے کہ حسرت حسن پرست تھے۔ اچھی صورت ہی انھیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی تھی، شیریں الفاظ، دلکش تراکیب اور مترنم بحروں کو بھی وہ ایک عاشق کی نظر سے دیکھتے تھے اور انھیں اپنا لینے

Scanned by TapScanner

کی کوشش کرتے تھے۔ مومن و نسیم کے وہ گرویدہ تھے تو اس لیے کہ ان کی شیریں کلامی اور رنگیں بیانی انھیں بہت بھاتی تھی۔ حسرت لکھنوی شاعری سے اپنا رشتہ جوڑنے کو کسرِ شان اور دوں ہمتی خیال کرتے تھے۔ فرماتے ہیں: "کیوں سلسلہ ملائیں کسی لکھنوی سے ہم" لیکن غالب کی طرح یہ احساس انھیں بھی تھا کہ لکھنؤ کی زبان میں زیادہ دلکشی و رعنائی ہے اس لیے انھوں نے زبان و بیان کے معاملے میں شعرائے لکھنؤ سے بھی فیض اٹھایا اور دہلی و لکھنؤ کی زبان کو اپنے کلام میں شیر و شکر کر دیا۔

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود — تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

اسی لیے حضرت اثر نے فرمایا کہ "حسرت کی شاعری میں لکھنؤ کی زبان اور متقدمین و متوسطین شعرائے دہلی کے تخیل کا بہترین امتزاج ہے۔"

حضرت مجنوں گورکھپوری کے ایک مختصر اقتباس پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں:۔

"بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اردو شاعری میں ایک اور نیا رجحان پیدا ہو گیا۔ آزاد خیال اور تربیت یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت یہ دیکھ کر کہ غزل کی ناو اب ڈوبا چاہتی ہے، اس فکر میں ہوئی کہ اس کو بچا کر نئے اور صاف ستھرے دھارے پر لگا دیا جائے تاکہ وہ سلامتی کے کنارے پر پہنچ کر اپنی بقا اور ترقی کے نئے سامان مہیا کر سکے۔ اس جماعت کے امام حسرت موہانی تھے جنھوں نے مرتی ہوئی اردو غزل کو نہ صرف از سرِ نو زندہ کیا بلکہ اس کو نیا وقار اور نئی حیثیت دی۔"

٭٭٭

Scanned by TapScanner

3

فانی بدایونی

مومن کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں :-

"مومن کے یہاں فلسفۂ غم، تغزل، زبان سبھی کا امتزاج ہے۔ اس دور میں غالب کی صحیح پیروی فانی نے کی ہے یا اقبال نے۔ فانی کے یہاں غم بھی ہے اور غم کا عرفان بھی۔ وہ فلسفی نہیں، لیکن استدلال اور طرزِ بیان فلسفیانہ ہے۔ وہ وارداتِ انسانی کے کامیاب مصور ہیں اور قدیم رنگ برتنے والوں میں فانی کا لہجہ سب سے زیادہ آفاقی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں سرور صاحب نے فانی کو ان کے اصل روپ میں پیش کرنے اور کلام فانی کی قدر و قیمت کا صحیح تعین کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ کلام فانی کا یک رخا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اکثر ناقدینِ غزل نے فانی کو یاسیات کے امام کا لقب دے کر یہ سمجھا کہ تنقید کا حق ادا ہوگیا۔ فانی کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی جوش نے کی۔ انھوں نے فانی کو بیوۂ عالم، سوز خواں، ہروقت بسورنے والا اور انسانیت کے درجے سے گرا ہوا شاعر کہہ کر خود اپنی تنقید کو اعتدال و توازن کے درجے سے گرا دیا۔

جوش کی نثر میں سنجیدگی اور متانت کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔ اس لیے ان کے تنقیدی نظریات پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں لیکن بعض معتبر نقاد بھی ان کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام رہے۔ فرخ پوری کو اشعارِ فانی کی "تلخی" میں "تیزابیت" نظر آئی۔ کلیم الدین احمد کو "تنگ دامانی" کا گلہ ہے۔ گورکھپوری فرماتے ہیں کہ "فانی کے مسلسل شیون و فریاد سے ناخوشگوار اثر پیدا ہوتا ہے اور ایک ے والی یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔" اقبال نے جو یہ کہا تھا کہ "شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق" بارے میں سرور صاحب کی رائے ہے کہ "کیا عجب یہ الزام فانی کی شاعری کو پیش نظر رکھ کر

کیا گیا ہو۔"

غزلِ فانی کی اس خصوصیت یعنی غم و اندوہ پر اتنا زور دیا گیا کہ باقی خصوصیات نظروں سے اوجھل ہوگئیں اور یہ حقیقت سامنے نہ آسکی کہ فانی کے بیشتر اشعار میں جو شعریت ہے وہ دوسروں کو نصیب نہ ہوسکی۔ وہ شاعری میں افادیت کے قائل نہیں تھے اور فن برائے فن کے اصول پر ایمان رکھتے تھے۔ اس لیے لفظوں کے انتخاب، ان کی ترتیب، شعروں کی تراش کی طرف خاص توجہ دیتے تھے جس سے ان کے یہاں بیان کی رعنائی پیدا ہوگئی۔ ان کے شعروں کی بے ساختگی، سادگی اور حسن ہمارے دل کو جذب کیے بغیر نہیں رہتے۔ شعر میں شعریت محض بیان کی دلکشی سے نہیں آتی۔ اس کے لیے خیال کی گہرائی بھی درکار ہے۔

فانی کسی اعلا درجے کے خیال کو ایسی شگفتگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس میں غضب کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول سرور صاحب کے ان کے اشعار کا فوراً دل پر اثر ہوتا ہے، ان کی صداقت کا یقین ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنی حالت بھول جاتے ہیں اور ان اشعار کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ہماری دنیا ہے۔ ہم اس سے بے خبر تھے۔ آج فانی کے سہارے ہم پھر یہاں قدم رکھ رہے ہیں۔ کبھی یہ دنیا جانی پہچانی نہیں بلکہ نئی ہوتی ہے۔ یہاں یہ نیاپن بالکل نیا نہیں۔ اس کی ترتیب نئی ہوتی ہے۔ وہ چیزیں جو پہلے ہم کسی اور ترتیب سے دیکھتے تھے، شاعر نے اس طرح سجائی ہیں کہ نئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس انوکھے پن اس چونکا دینے والی بات کی وجہ سے ہم تھوڑی دیر کے لیے سانس روک لیتے ہیں یا ہمارے منہ سے آہ نکل جاتی ہے۔ یہی شعر کی قیمت، یہی شعر کا انعام ہے۔

آیئے اب کچھ ایسے اشعار دیکھتے چلیں جو قنوطیت و یاس پسندی سے دور ہیں ——

سمجھتی ہیں مآلِ گل مگر کیا زورِ فطرت ہے　　سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آہی جاتا ہے

دل میں اک شمع سی جلتی نظر آتی ہے مجھے　　آکے اس شمع کو پروانہ بنایا ہوتا

دو گھڑی کے لیے میزانِ عدالت ٹھہرے　　کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

جن دنوں غزل کی نیا ڈانواڈول تھی اور سرسید و حالی کے نظریۂ شاعری نے غزل کے خلاف طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کردی تھیں حسرت اور ان کے ساتھ فانی نے غزل کو نئی زندگی عطا کی۔ پُرخلوص عشق کی کامیاب ترجمانی کی۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو عشقیہ شاعری میں فانی کا رتبہ حسرت سے بلند

ہے۔ انھوں نے عشقیہ شاعری کو فلسفیانہ بلندی عطا کی اور اس میں زیادہ گہرائی پیدا کی۔ حسرت کے عشق میں ذرا ہلکاپن، رنگ رلیوں کا انداز، آرزوئے وصال بلکہ کسی حد تک ہوسناکی ہے۔ فانی عیش پرستی کی دنیا سے دور رہے۔ انھوں نے ایسے شعر بھی کہے جن میں شوخی کا رنگ ہے تاہم وہ وصال کے لیے نہیں بنے ہجران کا مقدر ہے اس لیے ان کی عشقیہ شاعری پر اداسی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ غم کا جذبہ خوشی کے جذبے سے زیادہ محکم ہوتا ہے اور اس کی گرفت زیادہ مضبوط ہوتی ہے اور اس کی تاثیر بے پناہ ہوتی ہے۔ اب دیکھیے فانی کے کلام سے کچھ عشقیہ شعر۔ پہلے وہ جن میں شوخی و زندہ دلی ہے اور پھر کچھ ایسے شعر جن پر اداسی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے	وہ جو معصوم شرارت تھی، ادائے پہلے
بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا	مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا
ادائے آڑ میں خنجر کی، منہ چھپائے ہوئے	مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے
جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں	اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
تھیں کہو تمھیں اپنا بنا کے کیا پایا	مگر یہی کہ جو اپنے تھے سب پرائے ہوئے
دشمن جاں تھے، تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے	تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا	بات پہنچی تری جوانی تک
اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی	کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا
من جائیں اگر تم ہمیں جھوٹوں بھی مناؤ	وعدے سے، تسلی سے، دلاسے سے قسم سے

اور اب چند باتیں کلام فانی کے قنوطی عنصر کے بارے میں ـــ بے شک اک بے کراں درد، اک بے پایاں یاس و ناامیدی، ہڈیوں تک کو گھلا دینے والا ایک غم، ایک جاں کنی کی سی کیفیت (مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے) ایک مسلسل آہ ـــ یہی سب کچھ فانی کی زندگی کا سرمایہ ہے۔

رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں:

"ہماری المیہ کہانی میر کی پُردرد زندگی سے شروع ہوتی ہے۔ کتابِ الم کا دوسرا باب مغلیہ دور کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی زندگی سے شروع ہو کر دہلی کی تباہی پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کی تیسری قسط فانی کی رودادِ غم ہے جو ان کی ذات سے شروع ہو کر

انہی پر ختم ہوتی ہے۔"

اور فانی کا یہ غم محض روایت نہیں، ایک صداقت ہے۔ ان کے اجداد [illegible] تھے۔ انقلاب [illegible] کے ہاتھوں سب کچھ برباد ہو جانے کے باوجود فانی نے وراثت میں [illegible] عیش کی زندگی گزارنے کو کافی تھا مگر دنیوی معاملات کی سمجھ بوجھ نہ [illegible] زندگی تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ آسودگی کی تلاش حیدر آباد لے گئی۔ قسمت نے یہاں بھی [illegible] کی بے رخی دیکھی۔ جسے جی جان سے چاہا اس نے وفا کا صلہ نہ دیا۔ [illegible] شاعر کی قدر کرنے والا کوئی نہ ملا۔ زمانے کو مخالف اور ماحول کو ناسازگار پایا۔ خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال سکتے ایسی مٹی کے بنے نہ تھے۔ حالات کا رخ موڑ دیتے کہ ان میں کس بل نہ تھا۔ [illegible] کا غلبہ ہونا لازمی تھا۔ غالب کے سے اعصاب نہ رکھتے تھے کہ ہر فکر کو بھی مسکراتے رہتے۔ [illegible] خاصی توانائی کا ثبوت دیا ہے۔ کلام فانی کا مطالعہ کیجیے تو شاعر کے دو روپ نظر آتے ہیں ـــ [illegible] کرنے والا، ان کی فلسفیانہ توجیہ کرنے والا اور کبھی کبھی ایک صدمہ سہہ جانے کے بعد دوسرے صدمے کا [illegible] آپ دیکھتے چلیے ـــ

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں	مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا
اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب!	در و دیوار دیے، اب انھیں ویرانی دے
میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول	تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

شاعر کا دوسرا روپ وہ ہے جو غموں سے پسپا ہوتا ہوا اور حالات سے ہار مانتا ہوا نظر آتا ہے۔ چند شعر ایسے بھی سن لیجیے ـــ

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا	زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے	ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا
ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میّت فانیؔ	زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے	دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

Scanned by TapScanner

دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

اور وہ پوری غزل جس کی ردیف ہے "دیکھتے جاؤ" اور خاص طور پر یہ شعر ـــ

ٹُٹے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ہم اس مختصر مضمون کو جناب مجنوں گورکھپوری کی اس رائے پر ختم کرتے ہیں کہ "فانی نے اردو غزل کو نئی سمت کی طرف موڑا اور مواد و اسلوب دونوں کے اعتبار سے اس میں نئی وسعتیں اور صلاحیتیں پیدا کیں" اور فانی کے چند شعر سنا کر رخصت چاہتے ہیں ـــ

فصلِ گل آئی یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ حسن کچھ برہم نظر آیا مجھے

* *

5

فراق گورکھپوری

فراق گورکھپوری اردو غزل کی دنیا میں ایک نئی آواز، ایک منفرد لب و لہجہ اور اچھوتے شعری تجربات کے ساتھ داخل ہوئے۔ ان کے اشعار نے قارئین کو صرف چونکایا ہی نہیں بلکہ اکثر مایوس بھی کیا۔ ناقدینِ غزل کا ایک حلقہ یقین رکھتا تھا کہ یہ آواز غزل کے مزاج سے میل نہیں کھاتی اس لیے جلد مر جائے گی۔ لیکن سچی شاعری دھیرے دھیرے دلوں میں گھر کر لیتی ہے اور اپنی جگہ آپ بنا لیتی ہے۔ فراق کی غزل نے ایک چھوٹے حلقے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور یہ حلقہ بتدریج بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ آواز اردو غزل کی دنیا پر چھا گئی۔ آخر ایک دن ایسا آیا جب یہ کہا جانے لگا کہ یہ دور فراق کا دور ہے۔ محمد حسن عسکری نے اعتراف کیا کہ "دس سال کے عرصے میں فراق کی شاعری اور تنقید نے اردو پڑھنے والوں کے ذوق بلکہ طرزِ احساس کو بدل کے رکھ دیا ہے اور ایسے چپکے چپکے کہ خود اپنی طبیعت کو پتا نہیں چلنے پایا۔ اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے، فراق کے محاورے سنائی دیتے ہیں، فراق کی آواز لرزتی ہے — بالکل اسی طرح جیسے غزل گو شعرا کے یہاں میر اور غالب کا احساس اور محاورہ جا بجا ٹپک اٹھتا ہے۔ پچھلے تین چار سال میں جو اردو غزل کا احیا ہوا وہ پچھتر فی صدی فراق کا مرہونِ منت ہے۔ فراق کی شاعری نے اردو میں ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ شاعر تو شاعر عام پڑھنے والوں کے شعور میں فراق کی شاعری رچتی چلی جا رہی ہے۔"

غزل میں فراق کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اساتذۂ فن کی پیروی نہیں کی بلکہ غزل کے پرانے سانچے کو چکنا چور کر دیا۔ معمولی اور غیر معمولی فن کار میں یہی فرق ہوتا ہے کہ معمولی فن کار روشِ عام پر چلنے ہی کو بڑی بات سمجھتا ہے جبکہ غیر معمولی فن کار اسے کسرِ شان سمجھتا ہے اور اپنا راستہ آپ نکالتا ہے۔

فراق ایک بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک شاعر کے بیٹے تھے اور شعری ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی، اردو فارسی کی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ جواہر لال نہرو کے اصرار پر قومی تحریک میں حصہ لے چکے تھے اور اس سلسلے میں ایک سال کی قید بھی کاٹ چکے تھے۔ سول سروسز کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر بھی رہے تھے۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے انگریزی ادب کی تدریس کو مستقل پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا اور مغربی ادب کے چشموں سے سیراب ہوئے تھے۔ ہندو دیومالا ان کے خون میں رچی بسی تھی۔ ہندو فلسفۂ حیات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ہندی اور سنسکرت ادب کا توجہ سے مطالعہ کیا تھا۔ دیکھا آپ نے، کیسی ہمہ جہت شخصیت پائی تھی فراق نے۔ جب ان کی تخلیقی شخصیت بیدار ہوئی تو کوئی مروجہ سانچہ ایسا نہ تھا جو اسے اپنی ذات میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اردو غزل جو فارسی شاعری اور ایرانی تمدن کی پروردہ تھی، فراق کی تخلیقی اپج کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ فراق کی تخلیقی اپج ایسی زبان اور ایسے لہجے کی تلاش میں سرگرداں رہی جو اسے سہار سکے۔ اس تلاش میں فراق نے دور و دراز کا سفر کیا، کبھی وہ مصحفی، ذوق، ناسخ اور داغ تک پہنچے، کبھی دیر تک کلامِ میر کا لطف لیتے رہے۔ یہ تلاش اردو شاعری تک محدود نہ رہی کالی داس، ٹیگور، سورداس، بہاری اور کبیر بھی ان کی توجہ کا مرکز رہے اور شیلی، کیٹس، ورڈز ورتھ بھی۔

اتنے مختلف النوع اثرات سے جو لہجہ وجود میں آیا وہ اردو غزل کے لیے اجنبی اور اکھڑا اکھڑا تھا اور اس کی موسیقی عجب کھردری سی تھی۔ اسے دیکھ کر اہلِ نظر نے فتویٰ صادر کر دیا کہ اردو کے ایوانِ غزل میں اسے جگہ نہیں دی جا سکتی۔ مگر فراق نے ہمت نہیں ہاری۔ دو غزلے، سہ غزلے اور چہار غزلے کہتے رہے۔ لگاتار لکھنے سے کچھ تو لہجہ نکھرا، کچھ یہ بھی ہوا کہ قارئین اس لہجے کے عادی ہوتے گئے۔ بات بننے لگی اور غزل کی دنیا میں فراق کا سکہ چلنے لگا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے فراق کو بہت محنت کرنی پڑی۔ انھوں نے سچ کہا ہے:

میں نے اس آواز کو مر مر کے پالا ہے فراق

فراق کی غزل پر آگے گفتگو کرنے سے پہلے، آیئے ان کے کچھ شعر دیکھیں اور ان کی روشنی میں فراق کی غزل کے محاسن و معائب کا جائزہ لیں۔

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن — پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

Scanned by TapScanner

اے فراقؔ آفاق ہے کوئی طلسم اندر طلسم ہے ہر اک خواب اک حقیقت، ہر حقیقت ایک خواب
جینا جو آگیا تو اجل بھی حیات ہے اور یوں تو عمرِ خضر بھی کیا بے ثبات ہے

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جائے ہے
میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں، یاد اتنا کیوں آؤ ہو

دربارِ عشق میں تھے ہزاروں امیدوار کچھ عرضیاں قضا نے بھی آکر گزاریاں
اے قلبِ سرنگوں! کبھی ہنس بول بھی ذرا خوشیاں ہزار میں نے ترے در پہ واریاں

رات چلی ہے جوگن بن کر، بال سنوارے، لٹ جھٹکائے
چھپے فراقؔ گگن پر تارے، دیپ بجھے ہم سو جائیں

کس لیے کم نہیں ہے دردِ فراقؔ! اب تو وہ دھیان سے اُتر بھی گئے
اس نے کی پرسشِ حالات تو منہ پھیر لیا دلِ غمگیں کے یہ انداز خدا خیر کرے
کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں عشق توفیق ہے گناہ نہیں
اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی اس بھری محفل میں ہم تنہا نظر آنے لگے

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلوگے مگر پا نہ سکوگے

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

یوں سمجھ بیٹھے تھے گویا بھول بیٹھے ہیں تجھے
رات تیری یاد سے دل میں وہ درد اٹھا کہ بس!

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں تم نے تو خیر بے وفائی کی
دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں کے چراغ

وہ تمام روئے نگار ہے، وہ تمام بوس و کنار ہے
وہ ہے چہرہ چہرہ جو دیکھیے، وہ جو چومیے تو دہن دہن

اشعار میں ہیں عارض و کاکل کے وہ جلوے ہاں دیکھ کبھی تو مری غزلوں کی شبِ ماہ

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فراق کی غزل اور اس کی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے ہمیں بہت سے اشعار پیش کرنے پڑے۔ فراق کا کلیات اتنا ضخیم ہے کہ اس کا مطالعہ کرنا اور ان کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنا ایک دشوار کام ہے۔ وہ ایک زود گو اور پُرگو شاعر ہیں۔ فراق مصحفی کے گرویدہ رہے ہیں۔ جلد شعر کہنے اور زیادہ شعر کہنے کی تحریک ممکن ہے انھوں نے مصحفی سے ہی پائی ہو۔ ایسے شاعر کے ساتھ ایک دشواری یہ ہوتی ہے کہ ایک بار شعر کہہ دینے کے بعد مڑ کر اس کی طرف دیکھنے اور نوک پلک سنوارنے کی اسے مہلت ہی نہیں ملتی۔ اس سے شاعری کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہی فراق کے ساتھ ہوا۔ اشعار کے انبار میں سے ان کے اصل صحیح کے شعر ڈھونڈ نکالنا بہت دشوار ہے۔ بہرحال ایک ایسا مختصر انتخاب یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے فراق کی غزل کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

فراق کی نکتہ رس طبیعت، ان کے ذہن کی براقی، ان کا وسیع تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے فراق کی غزل کو زریں اور بیش قیمت شعری تجربات سے مالامال کر دیا ہے۔ اپنے عہد کی پیچیدہ زندگی کے مسائل کو فراق نے اپنی گرفت میں لیا ہے، اپنے احساس کا جزو بنایا ہے اور اشعار کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ فراق کی غزل اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائی ہے۔ ان کی غزل کا لب و لہجہ سکون، نرمی اور ٹھنڈک سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اچھوتے تجربات کے لیے لہلہاہٹیں، رسساہٹیں، ملگجاہٹیں جیسے الفاظ وضع کرتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق کبھی کبھی وہ میر کی زبان (گزاریاں، واریاں، جاگو ہو، بھاگو ہو) بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندو دیو مالا سے انھوں نے اپنی غزل کو ایک خاص دلکشی بخشی ہے۔ اسی سلسلے میں وہ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ بھی بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔

غزلِ فراق کا محبوب عورت ہے اور اس کے جسم کے پیچ و خم کو وہ بہت لطف لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ان کا تصورِ عشق بھی روشِ عام سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ غزلِ فراق کا عاشق بہت تیکھے مزاج کا واقع ہوا ہے۔ محبوب کو اس کا احساس ہے۔ اس لیے وہ اپنے قدردان کی ناز برداری کرنے سے نہیں چوکتا۔ فراق کو اپنی عشقیہ شاعری پر ہی نہیں بلکہ پوری شاعری پر فخر ہے اور یہ کچھ بے جا بھی نہیں۔ بڑا شاعر اپنی

بلند تیگی سے بے خبر نہیں ہوتا۔ فراق فرماتے ہیں ـــــ

کہتے ہیں میری موت پر اس کو بھی چین ہی لیا
عشق کو مدتوں کے بعد ایک ملا تھا ترجماں

ختم ہے مجھ پہ غزل گوئیِ عہدِ حاضر دینے والے نے وہ اندازِ سخن مجھ کو دیا

ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھول رہی ہے
ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

بے شک فراق کی آواز انیسویں صدی کی ایک ناقابلِ فراموش آواز ہے۔

* *

فیض احمد فیض

فیض ہمارے عہد کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظمیں زیادہ اور غزلیں کم کہیں۔ اس کے باوجود غزل گو شعرا کے درمیان ان کا نام ہمیشہ ممتاز رہے گا۔ دراصل غزل ایک نازک فن ہے۔ جس طرح تیسرے درجے کی غزل کہنا بہت آسان ہے اسی طرح اوّل درجے کی غزل کہنا بہت دشوار ہے خاص طور پر ایک ایسے شاعر کے لیے جو کسی مخصوص نظریے کا حامل ہو اور اپنے مخاطبین کے لیے کوئی خاص پیغام رکھتا ہو۔ فیض ساری زندگی ایک اعلا نظامِ حیات اور ایک بے عیب نظامِ حکومت کے علمبردار رہے اور اپنی شاعری میں اس کا پرچار بھی کرتے رہے لیکن شعری آداب کبھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی انداز پر ہوئی تھی۔ فارسی عربی انھوں نے علامہ اقبال کے استاد شمس العلما مولوی سید میر حسن سے پڑھی تھی۔ غالب و اقبال کے علاوہ انھوں نے میر کے کلام کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اردو فارسی کی کلاسیکی شاعری کے رموز و نکات سے وہ پوری طرح واقف ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں پورا کلاسیکی رچاؤ موجود ہے۔

فیض کی پرورش شعر و ادب کے ماحول میں ہوئی۔ کالج کی تعلیم کے دوران شعر کہنے لگے۔ کالج میگزین راوی میں کلام چھپا تو حوصلہ اور بلند ہوا۔ شاعری کا موضوع مجازی عشق تھا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ اس میں کشش باقی نہ رہی۔ نقشِ فریادی کے دیباچے میں لکھتے ہیں "آج سے کچھ برس پہلے ایک معین جذبے کے زیرِ اثر اشعار خود بخود وارد ہوتے تھے لیکن اب مضامین کے لیے تجسس کرنا پڑتا ہے۔ اگر محرکات میں کمی واقع ہو جائے یا ان کے اظہار کے لیے کوئی سہل راستہ پیشِ نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے یا طریقِ اظہار کو۔ ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے، اہلِ محفل کا شکریہ ادا کرے اور رخصت چاہے۔"

چنانچہ فیض کی شعری دنیا میں کچھ دنوں سناٹا چھایا رہا لیکن جلد ہی ایک قومی محرک نمودار ہوگیا۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو ان کا اپنا بیان: "جب ہم ۱۹۳۵ء میں امرتسر (ایم۔ اے۔ او کالج) میں پڑھاتے تھے تو ہمارے ساتھ ایک رفیق کار تھے رامپور کے جن کا نام تھا صاحب زادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم تھیں ڈاکٹر رشید جہاں۔ محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ایک ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم ہو جائے کیا تمھیں اس میں کوئی دلچسپی ہے؟ تو ہم نے کہا، ہاں! ہم ضرور اس میں کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا دور تھا۔ رشید جہاں نے کہا چھوڑو یہ عاشقی کا چکر۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دنیا کے جو دکھ ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ یہ تمھارا عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے اور انھوں نے ہمیں سکھایا کہ اپنا غم بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو اور اپنے لوگوں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے۔ ان کی بپتا کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ اپنے لیے ہی سوچتے رہو گے۔ یہ تو خود غرضی ٹھہری۔ ہمارا یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے ـــــ

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا　　　راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا"

فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اور محنت کش عوام کی حمایت میں شاعری کرنے لگے۔ اب انھیں اس دشواری کا احساس ہوا کہ سیدھے اور سپاٹ لفظوں میں کسانوں اور مزدوروں کی حمایت کریں تو شعر شعر نہ رہے۔ رمز و ابہام سے کام لیں تو ترقی پسند نقادوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جائیں کہ یہ تو بورژوا شاعری ہے۔ شاعری دراصل دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو خطابیہ یا براہ راست (ڈائرکٹ) شاعری اس میں سیدھے سادے لفظوں میں نثری انداز سے بات ادا کر دی جاتی ہے۔ یہ شاعری سپاٹ اور تاثیر سے محروم ہوتی ہے۔ دوسری قسم ہے بالواسطہ شاعری جس میں کبھی ابہام سے کام لیا جاتا ہے تو کبھی رمز و کنایے سے۔ کوشش اور جستجو کے بعد شعر کے معنی تک رسائی ہوتی ہے۔ مگر ذہن لطف سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

سپاٹ، خطابیہ شاعری فیض کے مزاج کے خلاف تھی لیکن ترقی پسند آمروں کی حکم عدولی بھی مشکل تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ ان کے یہاں جھوٹ اور سچی شاعری کی پیوند کاری نظر آتی رہی۔ وہ کوشش کرتے مگر اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہوتے اور جوڑ صاف نظر آتا۔ اس عرصے میں فیض کو قدردانوں کا ایک بڑا حلقہ میسر آگیا اور آخرکار انھوں نے اپنے گلے سے یہ طوق اتار پھینکا اور اس انداز میں شعر کہنے لگے جو ان کا خاص رنگ طبیعت تھا۔

فیض مظلوموں کی حمایت سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ ملک وقوم کی سربلندی کی آرزو کبھی ان کے دل سے محو نہ ہوئی لیکن ترقی پسندی کے ایک مختصر دور کے بعد ان جذبات و خیالات کا شاعری میں برملا اور واشگاف اظہار نہیں ہوا۔ انھوں نے جو کچھ کہا، علامت و استعارے کے پردے میں رمز و ابہام کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ انھوں نے عشق کی علامتوں کا سہارا لیا۔ مثلاً محبوب سے مراد مقصود ہے ملک وقوم۔ رقیب کہتے ہیں اور مقصد ہوتا ہے ملک و ملت کا دشمن۔ صبا ان کے یہاں امن و خوشحالی کی پیغامبر ہے، بہار آزادی و شادکامی کا استعارہ ہے۔

فیض پر ملک دشمنی کا مقدمہ چلا اور ان پر ایسے الزامات لگائے گئے جو سراسر بے بنیاد تھے تو انھوں نے کہا:-

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا　　　وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

سرکاری ایجنٹوں نے ڈرایا دھمکایا کہ حکومت کے خلاف لب کشائی بند کر دو اس میں جان کا زیاں ہے۔ اس دھمکی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے خلاف جدوجہد میں وہ زیادہ سرگرم ہو گئے۔ یہ داستان اس شعر میں سمٹ آئی ہے ـــــ

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب　　　وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے

اگر بات اشارے میں کہی جائے تو اس میں وضاحت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح کا ابہام رہ جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جس شعر میں رمز سے کام لیا جائے وہ زمان و مکاں سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ نہ کسی مقام میں قید رہتا ہے نہ کسی زمانے میں۔ اسے مثال کے طور پر اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ جب ان کے ملک میں اظہار خیال پر پابندی لگی تو انھوں نے اس کا ذکر صاف لفظوں میں نہیں کیا بلکہ رمز و کنایے کا سہارا لے کر اس طرح کیا ـــــ

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　　کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے　　　ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

کتنی سچی بات ہے کہ زباں بندی تو کی جا سکتی ہے مگر زنجیر کی جھنکار کو کون روک سکا ہے۔ جب زنجیر کھنکے گی تو دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ کسی کو پابہ زنجیر کر دیا گیا ہے۔ یہ دو شعر کسی خاص ملک اور کسی خاص زمانے کا حال نہیں سناتے بلکہ جب جب اور جہاں جہاں زبانوں پر قفل پڑیں گے تو یہ شعر یاد آئیں گے۔

Scanned by TapScanner

فیض نے استعارہ، کنایہ، پیکر تراشی جیسے شعری وسائل کا سہارا لے کر اپنے کلام کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے اور اپنے جذبات و افکار کو پورے فنی آداب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے شعروں میں نغمگی بھی بہت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں نہایت عمدہ دھنوں میں گائی جاسکتی ہیں اور گائی گئی ہیں۔ ان کی غزلوں سے چند منتخب اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں ـــــ

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے — تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
چمن میں غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری — قفس میں آج صبا بے قرار گزری ہے
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے — تو فیض دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں
کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی — سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ رمز و ایما سے کام لے کر فیض نے اپنے شعروں میں بے تعینی کی فضا پیدا کر دی ہے اور اپنی شاعری کو زمان و مکاں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

فیض کی شاعری پر یہ تنقید کی گئی ہے کہ اس کا کینوس محدود ہے۔ یہ کوئے یار سے نکل کر سوئے دار تک تو ضرور پہنچتی ہے (جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے) لیکن ان دونوں کے درمیان جتنے مقام آتے ہیں اور جن کا کوئی شمار نہیں، ان کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ ان کی تنگ دامانی کا گلہ بے شک درست ہے لیکن انھوں نے اس مختصر میدان میں جس کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے اس کے سبب ان کا شمار ہماری زبان کے چند بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ⁂ ⁂

Scanned by TapScanner